

## مولانا محمد رضوان القاسمی جامع کمالات شخصیت

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی

وہ ماہ شعبان کی 26 تاریخ (1425ھ) تھی اور اکتوبر کی 11 (2004ء)، امریکا میں صبح کے 4 بجے تھے کہ حیدرآباد سے بذریعہ فون حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی، ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی، خبر سن کر دل دھک سے ہو گیا، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، اٹکلبار آنکھوں کے ساتھ زبان پر وہی قرآنی ورد جاری ہو گیا جو صحائف کائنات میں بے نظیر اور غم و حزن کے بار کو ہلکا کرنے کا عارفانہ اور تیر بہدف نسخہ ہے یعنی ﴿وانا لله وانا الیه راجعون﴾ دماغ کی..... شریانوں میں انجماد خون کے باعث دماغ کی سرجری کی گئی، اس کے بعد ان پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا، صحت و عمر درازی کے لیے کئی دعائیں کی گئیں اور علاج و دوا کی ہر تدبیر کی گئی، مگر تقدیر کی مجبوری دیکھنے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی اور وقعت الواقعة (ہونے والی بات ہو کر رہی)۔

مولانا محمد رضوان قاسمی (1944-2004ء) سے راقم الحروف کا تعلق قریبی اور ہمہ وقتی تھا، اس تعلق کی ابتدا ہوئی طالب علمی کے ابتدائی دور سے جب کہ میں پورے طور پر سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا، پھر طالب علمانہ دور سے فراغت (روایتی اور اصطلاحی معنی میں) کے بعد یہ تعلق رفتار و وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا چلا گیا، یہ تعلق تدریسی ذمہ داریوں کی نسبت سے بھی تھا اور مولانا کے تصنیفی، تالیفی اور قلمی و تحریری امور میں معاونت و خدمت کی نسبت سے بھی، علمی اور دعوتی اسفار میں رفاقت کا تعلق بھی اور مولانا کی معیت میں ملی اور اجتماعی امور و مسائل سے متعلق مجالس میں شرکت کا بھی، افسوس کہ آج قلم اس مجسمہ علم و تحقیق اور پیکر ادب و دانش کے ماتم اور اس کے لیے اظہار رنج و الم پر مجبور ہے جس کے وصف و مدح کا فرض بار بار ادا کرنا پڑا ہے اور جس شخصیت کے لیے مدظلہ اور دامت برکاتہم جیسے الفاظ لکھے اور بولے جاتے تھے آج اس کے لیے دعائیہ کلمات اس طرح ادا کرنے پڑ رہے ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

دارالعلوم دیوبند نے جتنے کارآمد رجال علم و دین اور مردان کار پیدا کیے ان میں مولانا کی ذات امتیازی حیثیت کی حامل تھی، وہ ایک مخلص داعی و خطیب، عالم و فاضل، تامل و عمل، علم و ادب، طرز انبواب و دانش پر داز، نکتہ رس محقق



سے مالا مال کر دے۔

مولانا مرحوم پیدا تو صوبہ بہار کے ضلع دربھنگہ میں ہوئے، لیکن حیدرآباد سے انہیں تعلق خاطر تھا، یہاں کا علمی، دینی اور ادبی ماحول اور امن و محبت کی فضا انہیں پسند تھی، اسی لیے تعلیمی فراغت کے بعد دینی و دعوتی مقاصد کے لیے انہوں نے حیدرآباد کا جوڑخ کیا تو پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور اس شہر کی علمی فیاضیوں، دینی روایات اور تہذیبی قدروں کی تاریخی تسلسل کی زینت بن گئے، مسجد عامرہ جو پہلے سے سے نامور علماء و اصحاب فکر و عمل کا مرجع اور دینی، دعوتی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے، میں ان کے خطبات اور دروس قرآن و حدیث (مشکوٰۃ المصابیح) سے استفادے کے لیے لوگ ذوق و شوق سے حاضر ہوتے، عصری مسائل اور تقاضوں سے مربوط ان کے خطبات جمعہ، زمانہ آگہی، دینی بصیرت اور مومنانہ فراست کا نمونہ ہوتے تھے۔

دارالعلوم سبیل السلام، اس کا وسیع تر تعلیمی نظام اور اس کا تحقیقی، دعوتی اور تصنیفی و تالیفی کردار دراصل ان کے زر خیز دماغ، روشن فکر اور عالمانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے، انہوں نے اپنے انتظامی رفقا، معاونین اور مخلص اساتذہ و کارکنان کے تعاون سے اس ادارہ کو ہمہ جہتی ترقی دی، ان کی فکر یہ تھی کہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم سبیل السلام محض ایک تعلیم گاہ اور دینی درس گاہ نہ رہے بلکہ ملک و ملت کو درپیش مسائل میں وہ دینی رہنمائی اور سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا رہے، چنانچہ اس ادارہ کے زیر اہتمام علمی و فقہی مذاکرات اور دعوتی اجتماعات بھی ہوتے رہے اور ادبی سیمینار بھی، وعظ و ارشاد کی مجلسیں بھی قائم ہوئیں اور شعر و سخن کی بزم بھی آراستہ کی گئی، اصلاح معاشرہ کا پیام بھی سنایا گیا اور خدمتِ خلق کی راہ بھی دکھائی گئی اور اپنی ان ہمہ گیر خصوصیات کی وجہ سے یہ دارالعلوم ملک کا ایک ممتاز دینی، تعلیمی ادارہ بن گیا۔

مولانا مرحوم کو شعر و ادب سے فطری ذوق تھا، ان کی تحریریں، زور و قوت، دل کشی و دلآویزی سے معمور اور ادبی حیثیت سے بلند پایہ ہوتی تھیں، ان میں ادب و انشا کا جوہر، شعر و سخن سے دل چسپی، دیدہ وری اور کتہہ رسی شروع ہی سے موجود تھی، وہ عام علما کی طرح نہیں تھے جن کو اردو شعر و ادب اور سخن شناسی و شعر فہمی سے مناسبت نہیں ہوتی ہے ان کی تمام دعوتی و اصلاحی تحریریں، ادب و انشا کے باکپن، لطافت فکر، رعنائی خیال اور جادو بیانی سے آراستہ ہوتی تھیں، انہوں نے شاعری نہیں کی، گو کہ ان کی شاعرانہ طبیعت اپنے زمانہ طالب علمی میں اس ”وادی فکر و خیال“ کی سمت پوری طرح مائل تھی..... تاہم مولانا نے بوجہ یہ راہ ترک کر دی، انہیں شعر و سخن کے اصول و فروع اور فنی زاکتوں سے پوری طرح واقفیت تھی، اقبال اور ان کے اردو و فارسی کلام پر ان کی گہری نظر تھی بلکہ وہ ماہر اقبالیات تھے، شعری و ادبی حلقوں میں بھی وہ مانے گئے اور ارباب دین و دانش کے درمیان بھی ان کی اقبال شناسی تسلیم کی گئی، اقبال کا بیشتر کلام ان کے حافظہ کے خزانہ میں محفوظ تھا، اقبال شناسی کی وساطت سے وہ اسرارِ خداوندی کے محرم اور

رموزِ فطرت کے آشنا تھے، بقول شاعر

کھل جائیں گے کھلیل اس پر اسرارِ خداوندی  
اقبال کے اشعار انسان اگر سمجھے

اقبال کے علاوہ وہ بیسیوں شعراء کے اصلاحی اور تعمیری اشعار ان کے ذہن میں متحضر رہتے اور برجستہ اور مناسب حال شعروہ اس طرح استعمال کرتے جیسے وہ شعرا سی موقع کے لیے کہا گیا ہو، خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا گیلانی وغیرہ کا طرزِ تحریر اور علمی انداز انہیں بہت پسند تھا، مولانا عبدالمجید ریادئی کے ادبی اسلوب کے وہ ولدادہ تھے، زبان و بیان پر ان کی قدرت اور اس میں ان کی ندرت کے وہ قائل تھے۔

مولانا ایک بلند پایہ خطیب اور مقرر بھی تھے، ان کی تقریر، فصاحت و بلاغت کے ساتھ علمیت کے جوہر سے آراستہ ہوتی تھی ان کی آواز گرج دار تو نہیں تھی، مگر ان کی سنجیدہ گفتاری اور خوش بیانی متاثر کن ہوتی تھی کبھی موقع کی مناسبت سے اندازِ بیاں پر جوش اور موثر ہو جاتا تھا، عالمانہ رنگ و آہنگ اور خطیبانہ زیر و بم کے ساتھ تقریر میں علم و ادب کا احتراز نظر آتا تھا، ان کی تحریر و تقریر دونوں کی پشت پر مطالعہ کی قوت، اسلوب کی اثر آفرینی، الفاظ کی بندش، استعارات و تعلیمات اور بیان و بدائع کی جامعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی، اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے غالب و اقبال، میر و جگر، صفی وحالی، اکبر الہ آبادی اور امجد حیدر آبادی جیسے نامور شعراء کے اشعار بڑی خوبصورتی اور بہت ہی دل نشیں انداز میں موقع بہ موقع پڑھتے، قرآنی آیات اور نبوی روایات کے ساتھ اسلامی تاریخی نقوش، سلف صالحین اور اکابر علمائے دیوبند کے واقعات، جو معاشرہ کی اصلاح، ملی فلاح و بہبود اور کردارِ عمل کے فروغ میں معاون اور اثر انگیز ثابت ہوں، کو نہایت مرتب انداز میں پیش کرتے، امت کا اتحاد، معاشرہ کی اصلاح، انسانیت کی تعمیر، نئی نسل کی دینی تربیت، موجودہ حالات میں صبر و ثبات کی ضرورت، معاملات کی درستگی، مدراس اسلامیہ کی اہمیت اور ان جیسے تعمیری و اصلاحی موضوعات پر وہ اکثر لکھتے اور بولتے رہے، ان کی خطابت و تقریر کی یہی وہ لذت تھی جو حاضرین اور سامعین کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لیتی تھی، وہ ملک کے طول و عرض میں درس گاہوں، تحریکوں اور اداروں کی جانب سے خطبات کے لیے مدعو کیے جاتے تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بعض عمومی اجلاس کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظامت بھی کی ہے اور بورڈ کے جلسوں کو انہوں نے اپنی تقریروں سے گرمایا بھی ہے، ملی کونسل کے پلیٹ فارم سے قوم و ملت کے ضمیر کو بھونڈ اور بیدار کیا ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ہمدرد اور جامعہ ملیہ جیسی باوقار دانش گاہوں میں بھی انہیں پورے انہماک کے ساتھ سنا گیا، بہر حال ایک بات جو ان کی ہر تقریر اور ہر تحریر میں ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دماغ کی پہنائی

کا اندازہ ہوتا ہے، سچ کہا ہے صفی نے۔

تاثیر سخن کب سے حاصل نہیں ہوتی

یہ دین خدا کی ہے صفی جس کو خدا دے

مولانا کی شخصیت میں دین و ادب کا ایسا ہی حسین امتزاج پایا جاتا تھا جیسے کسی سرخ گلاب کی پتیوں میں بوئے گل اور رنگ گل، اپنی باوقار شخصیت کے ساتھ وہ ہر جگہ ممتاز نظر آتے، اصحاب علم و تحقیق میں عالم ذی وقار، شعر و ادب کی بزم میں ادیب با کمال، علما و قائدین کے حلقہ میں زعیم بے مثال، وہ مرجان مریخ شخصیت کے حامل تھے، وہ جہاں جاتے اپنی خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور جادو بیانی کا جادو جگاتے، راقم نے ملک و بیرون ملک کی مجلس میں اور اصحاب دین و دانش کی محافل میں دیکھا کہ اپنی معتدل فکر اور متوازن شخصیت کے باعث وہ ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے گئے، جدید تعلیم یافتہ اور عصری درس گاہوں کے فضلا سے بے تکلف مخاطب ہوتے، اسلامی علوم کے وسیع مطالعہ اور قرآن و سنت پر گہری نظر رکھنے کے سبب ان کی گفتگو میں حلاوت و تاثیر اور شانِ دل نوازی پائی جاتی تھی، اپنی بات کو سلیقہ، قرینہ اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا انہیں خوب ملکہ تھا، وہ عصر جدید کے تقاضوں اور دانش حاضر کی زبان و اسلوب سے پورے طور پر واقف تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو قدیم و جدید کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے صالح و نافع پہلوؤں کو اپنالیٹے ہیں، مسائل پر قابو پانے اور ابھی ہوئی گتھیوں کو حکمت، تدبر اور دانش مندی کے ساتھ سلجھانے کا ہنر جانتے تھے، کسی بھی معاملہ میں حوصلہ مندانہ جدوجہد کے ساتھ ”گوہر مقصود“ کو پانے اور ”ساحل مراد“ سے ہمکنار ہونے کا سراغ وہ جانتے تھے اور یہ راز بھی کہ۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات

یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

مولانا مرحوم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، آل انڈیا ملی کونسل، تنظیم اہل علم دارالعلوم دیوبند اور اسلامک فقہ اکیڈمی جیسے باوقار اداروں سے ذمہ دارانہ وابستگی رکھتے تھے، عمر کے آخری حصہ میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب کر لیے گئے تھے، اہل علم کے حلقوں میں وہ اپنی اصابت رائے، اعتدال فکر و نظر، وسعت مطالعہ، باخبری اور عصری آگہی کی وجہ سے امتیازی شان رکھتے تھے اپنی ان تمام ذمہ دارانہ حیثیتوں کے باوجود وہ ایک غیر متنازع فیہ شخصیت سمجھے جاتے تھے، ملی مسائل اور سماجی امور میں انہماک و توجہ کے ساتھ وہ ضرور حصہ لیتے، مگر سیاست کی پر خارا وادی میں انہوں نے کبھی اپنے دامن کو الجھنے نہ دیا اور نہ کسی سیاسی مجاز سے خود کو وابستہ کیا، معاصر اہل علم کے درمیان جس چیز میں وہ سب سے زیادہ ممتاز تھے، وہ ان کا حسن تدبر، دوراندیشی، معاملہ فہمی اور فکر و رائے کی

قوت تھی۔

مولانا کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی قلمی، تحریری، صحافتی اور تصنیفی صلاحیت تھی، ان کی تحریری و قلمی خصوصیات کے جائزہ کا یہ موقع نہیں، علمی و ادبی دنیا میں ایک ممتاز ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے وہ جانے اور مانے گئے، دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے افسوس ہے کہ وہ قلم و تحریر کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکے، ورنہ شاید وہ عظیم و مخیم کتابوں کے مصنف ہوتے، تاہم اپنی مشغولیات کے باوجود اصلاحی و ادبی مضامین اور علمی مقالات کے لیے وہ وقت نکال لیتے تھے، روزنامہ ”نویذ“ دکن کے دینی صفحہ کی ذمہ داری خوش اسلوب سے نبھائی، پھر اس کے بعد ”روزنامہ سیاست“ کے لیے وہ مضامین لکھتے رہے، ادھر چند برسوں سے ”آپ کے سوال“ کے زیر عنوان ان کا ہفتہ واری کالم بھی شائع ہوتا رہا اور ادبی صفحہ میں بھی ان کی تحریریں نگاہ شوق کے لیے سرور و تسکین کا سامان فراہم کرتی رہیں، آندھرا پردیش کے علاقہ میں علما کی نمائندہ جماعت مجلس علمیہ کے دینی و اصلاحی ترجمان ”قرطاس و قلم“ اور سبیل السلام کے سہ ماہی ”صفا“ کی ادارت بھی مولانا کے ذمہ تھی، دعوت و اصلاح، تعلیم و تربیت، تزکیہ و احسان، ادب و اخلاق، یہ سب مولانا کی تحریروں کے موضوعات ہوتے تھے، ان کے قلم گہر پارنے ”اسرارِ حیات“ سے پردہ اٹھایا ہے اور زندگی کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو میں بسانے کے لیے ”گلدستہ سنت“ بھی ترتیب دیا ہے، وقت کے تغیر، زمانہ کی رفتار اور زندگی کے قافلہ کی تیز گامی سے بے خبر اور آنے والے ”کل“ کی تیاری سے غافل انسان کو یہ پیام بھی سنایا کہ ”اے انسان! وقت کی قیمت پہچان“ اور مسافرانِ آخرت کو ”سفرِ آخرت“ کی داستان بھی سنائی، جرم و سزا کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ”مرض اور علاج“ کی تشخیص بھی کی ہے اور ”عصر حاضر میں دینی مدارس“ کے لے نشان راہ بھی متعین کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی یہ تحریریں گم کردہ راہ انسانیت کے لیے ”چراغِ راہ“ اور اپنی افادیت، نافعیت اور اصلاح و انقلاب امت کی راہ میں اپنی اہمیت و وقعت کے لحاظ سے ”گنجائے گرنامیہ“ کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا کی یہ تحریریں بیش قیمت علمی تحفہ ہیں جو انہوں نے دین و ملت کی نسبت سے لکھی ہیں اور دین کی امانت کو ”متارِ قلم“ کی صورت دیتے ہوئے امت کے سپرد کی ہیں، افسوس ہے کہ مولانا آج دنیا میں نہیں رہے، خدا ان کے درجات بلند فرمائے اور قوم و ملت کے لیے انہوں نے جو آثار اور علمی یادگار چھوڑی ہے اس کا سلسلہ فیض جاری رہے۔

اہل وفا ہر راہ گزر میں نقشِ قدم چھوڑ آئے ہیں اپنے  
بعد فنا بھی ذکر ان کا ہوتا رہے گا عالم عالم